عکسِ آواز اور اکیسویں صدی کے تقاضے

محمد عمران

Muhammad Imran

Ph.D Scholar, Department of Urdu,
Lahore Garrison University, Lahore.

نوید احمد

Naveed Ahmad

Ph.D Scholar, Department of Urdu,
Allama Iqbal Open University, Islamabad.

Abstract:

Dr.Mukhtar ud Din Ahmad is a prestigious name in the field of Urdu poetry in Europe. His poetic creation "Aks-e-Awaz" reflects the true picture of 21st century world. He has expressed a grave concern about the bleak future of humanity threatened by the harm effects of the scientific progress of the modern age. His poetry also depicts the economic exploitation of the third world countries by powerful states.Poet highlights the burning issues of the day like environmental pollution,water crisis and ever -increasing population. The satirical depiction of ruthless and Anti-Muslim strategies of super powers in Kashmir,Palestine,Iraq and Afghanistan is the testimony of poet's love and sympathy for Muslim Ummah. Without any iota of doubt, he has unveiled the double standards of Western countries.

برطانیہ کے علاقے ساؤتھ یارک شائر (South Yorkshire) کے ایک قصبے ریون فیلڈ (Raven Field) میں مقیم پاکستانی نژاد معروف اُردو شاعر ڈاکٹر مختار الدین احمد مختار کا شعری مجموعہ ''عکسِ آواز'' جو ۲۰۱۶ء میں الحمد پبلی کیشنز کراچی کے زیرِ اہتمام شایع ہوا، جدید طرزِ فکر کا عکاس ہے۔ یہ مجموعہ ایک ایسے شاعر کے احساسات و جذبات کا مرقع ہے جو چالیس برس سے یورپی تہذیب اور وہاں کے لوگوں کی سوچ کا چشم دید گواہ ہونے کی وجہ سے اکیسویں صدی کے تقاضوں سے بخوبی آشنا ہے۔

سوال یہ ہے کہ نئی صدی کے تقاضے ہیں کیا؟ نئی صدی میں شعروادب کے موضوعات کا دائرہ کار کیا ہوگا؟ ہیئت کے کون سے پیمانے معیاری ٹھہریں گے؟ سائنس اور ٹیکنالوجی کا ارتقا اسلوب پر کس طرح کے اثرات مرتب کرے گا؟ اس کا انحصار شاعر کے اندازِ فکر، معاشرتی ماحول، علمی سطح اور نظریۂ حیات کے علاوہ اس کے خوابوں اور خدشوں پر ہے مگر ایک بات طے ہے کہ نیا عہد، نئے موسموں کی نوید ہوگا۔ عہد موجود میں اُردو شعروادب نے قریب قریب ماضی کی ادبی دھڑے بندیوں سے آزادی کا نعرہ بلند کر دیا ہے۔ آج کی غزل اپنے طرزِ فکر میں آزاد ہے اور زندگی کے بارے میں اپنے محسوسات، زیبِ قرطاس کرنے کے لیے مشاہدے اور تجربے کو روشنی بناتی ہے۔ وہ اسلوب کی روایتی تشبیہاتی واستعاراتی روش میں بھی نئی راہیں تلاش کرنے کی خواہاں ہے۔ ساقی، شراب، رند، واعظ اور گل وبلبل کے استعارے اب اسے نہیں بھاتے۔ غزل کے اس بدلتے اسلوب کے بارے میں پروفیسر شارب ردولوی لکھتے ہیں:

> ''نئی غزل کی ایک بڑی خوبی اس کا کسی چیز کو دیکھنے اور بیان کرنے کا زاویہ ہے۔ وہ زبان کے اعتبار سے بھی روایتی غزل سے مختلف ہے اور تشبیہات واستعارات میں بھی۔ وہ آج کی زندگی سے اپنے استعارے اور تشبیہیں اخذ کرتی ہے اس نے جدیدیت اور ترقی پسندی کی حد بندیوں کو ایک طرح سے توڑ دیا ہے اور صرف زندگی، تجربے اور محسوسات کو سامنے رکھا ہے۔ اس کی زبان، اظہار اور اسلوب بھی اپنا ہے اور اس کے زندگی کے تجربات بھی اپنے ہی ہیں۔''(۱)

ڈاکٹر مختار الدین احمد کے کلام کا نمایاں وصف ان کا رجائیت پر مبنی لہجہ ہے۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ وہ نئے عہد کے تقاضوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے ہر دم تیار ہیں اور مایوسی سے پہلوتہی کرتے ہوئے نئے چیلنجز سے عہدہ برآ ہونے کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔ ایسے میں اُن کا لہجہ جوش وجذبے سے لبریز ہو جاتا ہے اور ایک ایک لفظ توانائی اور تحرک کا مظہر بن کر اُبھرتا ہے۔ مثالیں دیکھیے:

محو کر دے حافظے سے حسرتوں کے سرد راگ
گیت گا اب طرز نو پر، تار ماضی کے نہ چھیڑ
روح کو آلودۂ عصیانِ ناکامی نہ کر
ذہن کے اوراق سادہ خونِ دل میں مت لتھیڑ(۲)

ڈاکٹر مختار الدین احمد کے ہاں فکر وفلسفہ کا موضوع کلیدی اہمیت کا حامل ہے اور فکر وفلسفہ کی حدیں سائنس سے ملی ہوئی ہیں۔ فلسفی اور سائنس دان ہر دو حضرات نے ابتدائے آفرینش پر فلسفیانہ روشنی ڈالی ہے۔ اگر چہ زندگی کے آغاز کے بارے میں سائنس حتمی رائے دینے کے قابل نہیں ہوئی مگر ڈارون کا نظریۂ ارتقا ہو یا بگ بینگ کا نظریہ اس نے انسان کو بحث کے نئے موضوعات ضرور فراہم کیے ہیں۔ ایسا ہی ایک موضوع روح کی حقیقت اور روح اور مادے کے پُر اسرار تعلق پر مبنی ہے جس میں عرفانِ ذات کے کئی راز پوشیدہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب روح اور مادے کی پُر اسراریت پر جو سوال اُٹھایا ہے اگر چہ وہ قدیم ہے مگر اس

کی معنویت آج بھی زندہ و جاوید ہے اور تب تک قائم رہے گی جب تک انسان کا ذوقِ جستجو تسخیرِ حقیقت سے آشنا نہیں ہو جاتا۔

بگ بینگ سے نکلی ہے کہ کُن کی جائی
یہ بات سمجھ میں نہیں آئی بھائی
مٹی ہے لحد ، مٹی ہی رحمِ مادر
مٹی میں مگر جان کہاں سے آئی؟(۳)

شاعر کسی بھی معاشرے سے تعلق رکھتا ہو جب تک وہ روحِ عصر سے رشتہ استوار نہیں کرتا، اس کی تخلیقی کاوشیں سودمند ثابت نہیں ہو سکتیں۔ ڈاکٹر مختار میڈیکل کے شعبے سے وابستہ ہونے کی بنا پر جدید میڈیکل سائنس کے کارناموں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ موجودہ عہد میں سائنس نے کلوننگ (Coloning) اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے مراحل طے کر کے انسانی عقل کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ ان کی نظم ''گمنام'' ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جس کی اٹھارہویں سال گرہ پر اس پر منکشف ہوتا ہے کہ اس کا باپ اُس کا باپ نہیں ہے اور کسی گمنام نطفے نے اسے وجود بخشا ہے تو اس پر بے یقینی کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ اُس نوجوان کے نفسیاتی کرب کا اندازہ اس نظم سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر مختار صاحب نے عصرِ حاضر میں سائنسی ترقی کے انسانی زندگی پر اثرات کو جس عمیق مشاہدے سے پرکھ کر ادب کے قاری کو دعوتِ فکر دی ہے وہ یقیناً قابلِ داد ہے۔ اُس کی مثال دیکھیے:

''مرے بیٹے ہو تم لیکن تمھارا باپ کوئی اور ہے / نہ جانے موت کیا ہو گی مگر یہ بات پیغام
اجل بن کر / گری دل پر / تڑپ کر میں نے اپنی ماں کی جانب کی نظر / جس میں سوالوں کا
سمندر تھا / تو اس نے یہ کہا اے جاں / تمھارا باپ اور میں بانجھ ہیں دونوں / طبیبوں نے کسی
گم نام نطفے کو کسی گمنام ہیضے سے / ملا کر بار آور کر کے میری کوکھ بھر دی تھی / جنا ہے میں نے تم
کو پر تمھاری ماں نہیں ہوں میں۔''(۴)

سائنسی ارتقا نے زندگی کے تمام شعبوں میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ ماضی کی داستانوں کے اُڑن قالین ہوائی جہازوں کے رُوپ میں ہمارے سامنے ہیں اور اب جناتی برق رفتاری کے حصول کی کوششیں جاری ہیں۔ یہ معجزاتی تسخیر مستقبل میں ممکنہ صورت اختیار کر لے کچھ بعید نہیں۔ اسی امکانی صداقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاعر نے سائنس کو یوں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

بادباں سے ، بھاپ سے، آتش سے تھے حرکت پذیر
اب فضا میں وہ ارادے سے رواں ہو جائیں گے(۵)

عہدِ حاضر میں سائنس نے زندگی ہی نہیں بل کہ ادب کو بھی متاثر کیا ہے یعنی ادب اور ادیب بھی ان اثرات کی زد میں ہیں۔ تخلیق کے داخلی و خارجی ہر دو پہلوؤں میں نئے جہانوں کی تلاش کا عمل جاری ہے اور سائنس کے افادی پہلو پیشِ نظر ہیں تو تخلیق کار سائنس کے منفی پہلوؤں سے صرفِ نظر کیسے کر سکتا ہے۔ ایٹمی تابکاری سے خاص طور پر اوزون کے دبیز پردے یا تہ میں شگاف پیدا ہونے کے علاوہ اس سے انسانی صحت پر مہلک اثرات مرتب ہو رہے ہیں لیکن سب سے بڑا خطرہ ایٹمی ہتھیار ہیں جن کی ہولناک تباہی جاپان میں ساری دنیا دیکھ چکی ہے اور اس کی وجہ سے مستقبل میں انسانی زندگی کا وجود داؤ پر لگا ہوا ہے۔ اردو

ادب کا شاعر اور قاری بھی اس تشویش سے بچے ہوئے نہیں ہیں۔ ''ایٹمی صبح'' سے اقتباس ملاحظہ ہو:

ہر طرف ایک چمک دار دھماکا ہو گا
روح انسان کے ڈھانچوں سے نکل جائے گی
اور ہر سمت زمانے میں اندھیرا ہو گا(۶)

انسانی زندگی کی بقا کا راز عناصر فطرت کی بقا سے مشروط ہے۔ اکیسویں صدی میں غذائی قلت، پانی کے بحران، ماحولیاتی بگاڑ اور بڑھتی ہوئی آبادی انسان کے لیے توجہ طلب مسائل ہیں۔ ان مسائل کے حل کے لیے سبز انقلاب اور جیوانجنیئر نگ کی اصطلاحات متعارف کرائی جا رہی ہیں اور عالمی سطح پر (Pollution Day) کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح ایک بڑا مسئلہ پانی کا بھی ہے۔ زیرزمین پانی کی قلت سے کئی بڑے ممالک میں آئندہ نسلوں کی بقا خطرے میں نظر آ رہی ہے۔ ہمارے ہاں بھی بڑے شہروں میں پانی کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے روئے زمین کے ہر دردمند انسان کے دل کی پکار بن کر نہ صرف اپنے دانش ور ہونے کا ثبوت دیا ہے بل کہ فطرت کے حوالے سے شعور و آگہی کا پیغام عام کرنے میں اپنی ذمہ داری بھی نبھائی ہے۔ وہ انسان کے ماحول دشمن رویے کو اُجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اپنے دریاؤں نے آخر ترک بہنا کر دیا
بس کناروں پر لکھے سیلاب باقی رہ گئے(۷)

☆☆☆

پھل پھول، چھاؤں، آب و ہوا جن کے دم سے تھی
افسوس کٹ کٹا کے وہ ٹکڑے ہوئے درخت(۸)

درخت ہمارے ماحول کے بے حد مخلص محافظ ہیں۔ ایک بڑا درخت روزانہ پانچ سو سے سات سو افراد کو مفت آکسیجن فراہم کرتا ہے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کے انجذاب سے فضا کو شفاف بناتا ہے۔ درختوں کی افادیت کے پیش نظر ڈاکٹر صاحب نے انھیں کمال خراج تحسین پیش کیا ہے:

ناز کرتا درخت ہونے پر
میں اگر آدمی نہیں ہوتا(۹)

دورِ حاضر میں دنیا گلوبل ویلج بن چکی ہے۔ معاشرے کا فرد ہونے کے ناتے شاعر اور ادیب عالمی سطح پر رُونما ہونے والے حالات و واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سیاسی حالات پر نگاہ ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ اکیسویں صدی کے آغاز سے ایک دہائی قبل ہی روس کا شیرازہ بکھرنے سے دنیا میں طاقت کا توازن قائم نہ رہا۔ ۱۹۱۷ء میں طلوع ہونے والا اشتراکیت کا سورج افغانستان کی سرزمین میں غروب ہو گیا تو سرمایہ دارانہ نظام کو کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ جدید ترقی کے زیر اثر اب یہ نظام ملٹی نیشنل کمپنیوں کا رُوپ اختیار کر گیا ہے اور ترقی یافتہ ممالک ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (WTO) کے ذریعے غریب ممالک کا معاشی استحصال کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ۹/۱۱ کی آڑ میں عالمی طاقتوں کو اپنی ہوس گیری کی تمنا پوری کرنے کا موقع میسر ہوا جو افغانستان اور عراق کے سقوط کی صورت میں سامنے آیا۔ عالمی منڈیوں پر اجارہ داری، تیل کے ذخائر کا حصول، عسکری جنون کا

فروغ اور ہوسِ اقتدار امریکی اور یورپی استعمار کے بنیادی عناصر ہیں۔اس کے علاوہ عالمی طاقتوں کا ایک اہم ایجنڈا اسلام دشمنی ہے جس کے شاخسانے تیسری دنیا کے غریب ممالک کے استحصال سے ملتے ہیں۔اس حوالے سے علی تنہا رقم طراز ہیں:

''اردو ادب میں بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے انقلاب آفرین ارتقا ظہور پذیر ہوتا گیا۔ سامراجی افکار اور فنی یکسانیت یا فرسودگی ختم ہوئی مگر اکیسویں صدی میں صورتِ حال مختلف ہے۔طبقاتی نظام کا نیا جال شکاریوں کے ہاتھ میں ہے۔ماضی میں یہ جال ترقی پسندی نے توڑا تھا مگر اب یہ حال ملٹی نیشنل کمپنیوں نے پھینکا ہے اور مقابل بے دست و پا غریب ملکوں کے عوام ہیں۔''(۱۰)

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ترقی یافتہ ممالک نے اپنا معیارِ زندگی بلند رکھنے کے لیے غریب ممالک کا استحصال کر کے جان بوجھ کر انھیں پسماندہ رکھا ہے۔اُن کے لیے تیسری دنیا کی اصطلاح وضع کر کے طبقاتی تفریق پیدا کرنے کی سازش سب کے سامنے ہے اور یہ کام کسی اور کا نہیں تہذیب یافتہ ممالک کا ہے۔غریب ممالک کو غریب تر بنانے کے لیے معاشی ترقی و خوش حالی کے نام پر جو مالیاتی پیکج دیے جاتے ہیں،ان سے ان کی آزادی سلب کر لی جاتی ہے۔فرانس کے وزیرِ اعظم پال رمیڈیئر کے مطابق:

''ہر وہ قرض جو ہم لیتے ہیں اس کے ساتھ ہی ہماری آزادی کا ایک حصہ ہم سے جدا ہو جاتا ہے۔''(۱۱)

غریب ملک ایک بار قرض کے چنگل میں پھنس جائے تو پھر اس کی معیشت برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔IMF جیسے ادارے عالمی طاقتوں کے جال ہیں جو قرض سے زیادہ سُود وصول کر کے ممالک کو معاشی نقصان پہنچاتے ہیں۔تیسری دنیا کے ممالک کی ابتر معاشی حالت اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں جہاں آنے والی نسلیں بھی قرض میں ڈوبی پیدا ہو رہی ہیں۔یہ امر اس بات کا متقاضی ہے کہ انسانی حقوق کے نام نہاد علم برداروں کو اصلیت سے آگاہ کیا جائے۔اس اندوناک صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے شاعر لکھتا ہے:

اک قرض مری جان پہ بڑھتا ہی گیا ہے
قسطیں تو بہت دی ہیں ادا کچھ نہیں ہوتا(۱۲)

☆☆☆

دوسرے درجے کا شہری تیسری دنیا میں ہوں
اس طرح جینے کو جاناں! کس طرح جینا کہوں؟(۱۳)

اب ذرا اسی قرض کی شرع سود ملاحظہ ہو جو انتہائی دل دہلا دینے والی ہے:

سایا سروں پہ ، پیٹ میں روٹی ، بدن پہ پوش
اس کے عوض وہ ہم سے کریں نقدِ جاں طلب(۱۴)

ڈاکٹر مختار الدین احمد درد دل رکھنے والے وہ مسلمان ہیں جنھوں نے چالیس سال یورپ میں بسر کر کے مشرقی و مغربی

تہذیب کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے اور دلائل و براہین سے مغربی معاشرے اور میڈیا کی منافقت کا پردہ چاک کیا ہے۔ فرانس میں ننگے ناچ کی آزادی اور مسلم خواتین کے حجاب پر پابندی ہے۔ سوئٹستان میں مسجدوں پر گنبد بنانے پر پابندی ہے مگر ناموسِ رسالتؐ سے کھل کھیلنے کی ہر مہذب یورپی کو آزادی ہے۔ الغرض مغربی میڈیا اسلام کو غیر فطری مذہب اور مسلمانوں کو وحشی، بربر اور دہشت گرد ثابت کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ ہیروشیما، ناگاساکی، افغانستان، فلسطین اور عراق میں نہتے شہریوں پر ظلم ڈھانے والے جب مسلمانوں کو ظالم اور جابر کے القابات سے پکارتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب انھیں حقیقت کا آئینہ دکھاتے ہوئے اپنی رُودادِ غم یوں بیان کرتے ہیں:

یزیدوں ،بھیڑیوں کا فیصلہ یہ ہے مرے حق میں
مجھے وحشی ، مجھے ظالم ، مجھے خونخوار لکھا ہے(۱۵)

☆☆☆

الزام مجھ پہ تھا کہ میں شدت پسند ہوں
حاکم یزید، مدعی ابنِ زیاد تھا(۱۶)

یورپ اور امریکہ کا استعماری رویہ ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا ایک اہم موضوع ہے جسے بے نقاب کرنا اور اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا وقت کے ترجیحی تقاضوں میں سے ایک ہے۔ مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام پسماندہ ممالک کے وسائل کو اپنے حق میں بروئے کار لا کر اُن کا معاشی استحصال کرنے کا ایک وسیع نیٹ ورک ہے۔ دولت کی اس غیر مساوی تقسیم کو انھوں نے خوب صورت تشبیہ سے یوں بیان کیا ہے:

اس طرح تقسیم کی میراث غرب و شرق نے
ہر ثمر اُن کی طرف ہے ہر شجر میری طرف(۱۷)

نیولبرلزم کے ذریعے غریب ممالک کو محکوم رکھنے کی سازش کا پردہ چاک ہو چکا ہے۔ اپنی ضرورت کے پیشِ نظر بڑے ملکوں کی نظر اب تیل کے ذخائر پر ہے۔ عراق کے صدام حسین کے خلاف امریکی جارحیت تیل کے حصول کی طرف ایک پیش رفت تھی جس میں لاکھوں بے گناہ مسلمان موت کے منھ میں چلے گئے۔ اس حوالے سے ایک اہم حقیقت جو اس بات کو پایۂ ثبوت تک پہنچاتی ہے، وہ یہ ہے کہ:

''ساری دنیا کا ۸۰ فی صد تیل تیسری دنیا میں پیدا ہوتا ہے لیکن اس تیل کا ۸۰ فی صد پہلی دنیا میں استعمال ہوتا ہے۔''(۱۸)

مہذب آقاؤں کی ہوس پسندی اور منافع خوری سے آج کا دانش ور قطعاً بے خبر نہیں اور وہ طنزیہ انداز میں اس ظلم پر نوحہ کناں بھی ہے:

قیس کو صحرا میں دیکھا جستجو میں تیل کی
اُٹھ گئی رسم جنوں ، آداب باقی رہ گئے(۱۹)

ڈاکٹر مختار اس افسوس ناک ظلم اور بربریت کے حامل ہوس پسندوں کو ایسی سرمایہ دار کی دعوت دیتے ہیں جس سے

ٹوٹے ہوئے دل جڑ سکیں اور پژمردہ چہروں پر مسکراہٹ کی روح پرور بہار رونق افروز ہو سکے۔ اُن کی یہ تمنا الفاظ کے روپ میں ڈھل کر انسان دوستی اور محبت کا مژدۂ جاں فزا بن گئی ہے:

مری سرمایہ داری کا بس اتنا سا فسانہ ہو
کہیں ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے کا کارخانہ ہو(۲۰)

اکیسویں صدی میں درپیش چیلنجز کا اگر بنظر غائر جائزہ لیں تو سب سے پہلے یہ سوچ کارفرما ہوتی ہے کہ جدت، جدلیت اور ترقی کی دوڑ میں انسانیت کہیں بہت پیچھے رہ گئی ہے اور منافقانہ اقدار نے طبقاتی نظام کو ختم کرنے کا نعرہ لگا کر اسے مزید مضبوط بنیادوں پر استوار کر دیا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اس نظام کے مظلوم وظالم ہر دو صورت میں مسلمان ٹھہرتے ہیں۔ ادب خصوصاً شعر و شاعری میں تغیر پذیر زاویوں کو فروغ دینا ہوگا جس کی بہترین صورت ''عکسِ آواز'' کے شعروں میں نظر آتی ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ڈاکٹر مختار کی شاعری خوب صورت اسلوب کے تحت عہد موجود کے تقاضوں کی احسن انداز میں ترجمانی کرتی نظر آتی ہے۔ اس میں جدید سائنسی شعور بھی ہے اور انسان کے آفاقی مسائل کی دادرسی کی جستجو بھی؛ مغرب کے استحصالی اور استعماری رویوں پر طنز بھی ہے اور تیسری دنیا کی مظلومیت کی داستان بھی؛ مغرب کی اسلام دشمنی کا غیر جانب دارانہ تجزیہ بھی ہے اور اُمت مسلمہ کی اندرونی خلفشار پر چوٹ بھی۔ اُن کی شاعری صداقت، خلوص، انسان دوستی اور عدل و نصفت کی قدروں کی آئنہ دار ہے جس میں اُمت مسلمہ کی صدائے احتجاج کی بازگشت واضح طور پر سنائی دے رہی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شارب ردولوی، پروفیسر، اردو غزل: نئی صدی میں، مشمولہ: اکیسویں صدی میں اردو غزل، از ڈاکٹر منصور خوشتر، (مرتب)، دربھنگہ (انڈیا): المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، ۲۰۱۷ء، ص:۵۲

۲۔ مختارالدین احمد مختار، ڈاکٹر، عکسِ آواز، کراچی: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء، ص:۱۵۴۔۱۵۳

۳۔ ایضاً، ص:۸۳

۴۔ ایضاً، ص:۱۶۰۔۱۵۹

۵۔ ایضاً، ص:۱۸۹

۶۔ ایضاً، ص:۱۶۸

۷۔ ایضاً، ص:۲۳۴

۸۔ ایضاً، ص:۱۴۶

۹۔ ایضاً، ص:۲۶۲

۱۰۔ علی تنہا، اکیسویں صدی میں اردو ادب کا بیانیہ، مشمولہ: جنگ، روزنامہ، لاہور: ۱۲۴ اکتوبر ۲۰۱۸ء

۱۱۔ جان پرکنز/ محمد حنیف راؤ، مترجم: معاشی دہشت گردی، لاہور: نشریات، ۲۰۱۰ء، ص:۵

۱۲۔ مختارالدین احمد مختار، ڈاکٹر، عکسِ آواز، ص:۳۱۷

۱۳۔ ایضاً، ص:۳۳۸

۱۴۔ ایضاً،ص:۳۸۷

۱۵۔ ایضاً،ص:۴۰۱

۱۶۔ ایضاً،ص:۲۶۷

۱۷۔ ایضاً،ص:۴۳۲

۱۸۔ خالد سہیل، ڈاکٹر، سماجی تبدیلی: انقلاب یا ارتقا، لاہور: دارالشعور، ۲۰۰۹ء، ص:۶۳

۱۹۔ مختارالدین احمد مختار، ڈاکٹر، عکسِ آواز، ص:۲۳۴

۲۰۔ ایضاً،ص:۳۴۴

☆.....☆.....☆